علم الانسان ما لم یعلم
THE ALIGARH MUSLIM UNIVERSITY
ALIGARH
مسلم یونیورسٹی علی گڑھ
اقبال اور قومی یکجہتی
از
سید مظفر حسین برنی
(گورنر ہریانہ)

اقبال اور قومی یک جہتی

سرسید میموریل لیکچر

اور
قومی یک جہتی

• عالیجناب سید مظفر حسین برنی
گورنر ہریانہ

یہ خطبہ ۲۲ نومبر ۱۹۸۵ء کو
علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں سرسید میموریل سوسائٹی کی دعوت پر پڑھا گیا

تعدادِ طباعت ——— ایک ہزار

مطبع ——— شروانی آفسیٹ پریس، دہلی

سالِ اشاعت ——— ۱۹۸۶ء

خوشنویس ——— سراج رسولپوری

ناشر ——— دی پرنٹرس، امیر نشاں، علی گڑھ

زیرِ اہتمام

شعبہ رابطۂ عامہ، مسلم یونیورسٹی

علی گڑھ

پیش لفظ

ہندوستان میں مسلمانوں کی نشاۃ ثانیہ کے بانی سرسید احمد خاں نے ہندوستانی تاریخ کے ایک نہایت صبر آزما دور میں جب سلطنت مغلیہ کا زوال۔ انگریزوں کے عروج اور دور جدید کی ابتدا ہو رہی تھی ایک زوال آسا قوم کو شکست خوردگی کے احساس۔ ماحول کی تنگی اور ماضی کی محبت کی قید سے آزاد ہو کر اس زبوں حالی سے نجات دلانے کے لئے ایک ٹھوس اور حقیقت پسندانہ عملی قدم اٹھایا اور جو نسخہ کیمیا انھوں نے تجویز کیا، وہ جدید علوم کی تحصیل اور نئی سرکاری زبان انگریزی کے استعمال کا نسخہ تھا۔ چنانچہ بجنور۔ مرادآباد اور غازی پور کے بعد علی گڑھ کو علمی مرکز کے لئے تجویز کیا۔ اس لئے کہ سرسید کا نقطۂ نظر یہ تھا کہ جس قوم میں علم نہ ہوگا اس میں عمل کہاں سے پیدا ہوگا مسلمانوں کو پستی سے نکالنے کے لئے انھوں نے مدرسۃ العلوم کی بنیاد رکھی۔ پھر قوم کو اس راستہ پر چلنے پر آمادہ کرنے میں زندگی کے آخری لمحے تک کام کرتے رہے۔

سرسید جیسے عظیم مفکر۔ مصلح۔ دانش ور اور عصری آگہی والے بزرگ کی یاد میں مسلم یونیورسٹی نے "سرسید میموریل لکچرز" کا سلسلہ ۱۹۶۸ء سے شروع کیا۔ تاکہ ہر سال اہم ادبی۔ تاریخی یا سماجی موضوعات پر کسی دانش ور کو مقالہ پڑھنے کی زحمت دی جاسکے۔ چنانچہ کئی مشہور عالم اور دانش ور اِن میموریل لکچرز کے لئے مدعو کیے جاچکے ہیں۔

بدقسمتی سے گذشتہ کئی سال کے عرصہ میں حالات کے ناموافق ہونے کی وجہ سے یہ لکچرز نہیں کیے جاسکے تھے۔ ایک طویل عرصے کے بعد ملک کے ایک تجربہ کار ایڈمنسٹریٹر نامور ادیب اور ناقد اور ایک اقبال شناس شخصیت جناب سید مظفر حسین صاحب برنی گورنر ہریانہ سے استدعا کی گئی کہ وہ پھر سے "سرسید میموریل لکچرز" کو شروع کرنے میں ہماری

درخواست کو قبول فرمائیں۔ آپ نے از راہِ کرم ۲۷؍ نومبر ۱۹۸۵ء کو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے کینیڈی ہال میں اپنا مقالہ

"اقبال اور قومی یک جہتی"

کے عنوان سے پڑھا۔ اس لکچر کو سامعین نے جو کینیڈی ہال میں کھچا کھچ بھرے ہوئے تھے دل چسپی اور غور سے سنا۔ جنھیں اقبال کو نئی سمت، نئی جہتوں کے تحت دیکھنے کا موقعہ ملا۔ موصوف نے اس کی واضح نشان دہی ان الفاظ میں کی ہے۔

"بنیادی طور پر اقبال کو ایک ایسے بین الاقوامی نظام کی تمنا تھی جو اخوت اور اتحادِ بشری۔ ہم آہنگی اور قوموں کے باہمی امن و آشتی پر استوار ہو اور جس میں عظمتِ انسانی کا بول بالا ہو۔"

اس طرح اقبال کو مسلمانوں کے شاعر کی حیثیت سے محدود نہ کر کے اس کے کلام کو آفاقیت کا درجہ دئے جانے پر جناب برنی صاحب نے زور دیا ہے اور اُسے معقول دلائل کے ساتھ ثابت کر دکھایا ہے۔

مجھے توقع ہے کہ علمی، ادبی اور سیاسی حلقوں میں اس مقالہ کو اسی گہری نظر اور غور وفکر کے سچے جذبے سے پڑھا جائے گا جس جذبے کے تحت یہ مقالہ لکھا گیا ہے۔

سید ہاشم علی

۲۰؍ جون ۱۹۸۶ء

وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

جناب وائس چانسلر صاحب، جناب پرو وائس چانسلر صاحب، اساتذہ کرام، طلبا و طالبات، معزّز خواتین و حضرات!

میں وائس چانسلر صاحب کا بے حد ممنون ہوں کہ انہوں نے مجھے "سرسیّد میموریل لیکچر" دینے کے لئے دعوت دی۔ میں اس ادارہ میں اپنی حاضری کو ایک سعادت سمجھتا ہوں۔ اس کے علاوہ وائس چانسلر صاحب نے اور آپ حضرات نے جس محبّت، گرم جوشی اور خلوص سے میرا خیر مقدم کیا ہے، میں اس کے لئے آپ کا بے حد شکر گذار ہوں۔ مزید برآں وائس چانسلر صاحب نے میرے بارے میں جو جملہ ہائے خبر کہے ہیں، اے کاش! کہ میں ان کا اہل ہوتا۔ یہ سب وائس چانسلر صاحب کا حُسنِ ظن ہے۔ یونیورسٹی کے اربابِ حل و عقد کی محبّت، اخلاص، تواضع اور عزّت افزائی نے میرے دل و دماغ پر بہت گہرے اور کبھی نہ مٹنے والے نقوش چھوڑے ہیں۔ وائس چانسلر صاحب نے جس خلوص اور محبت کا سلوک کیا ہے وہ فی زمانہ نایاب ہے۔ غالبؔ کے الفاظ میں ؎

وفائے دلبراں ہے اتفاقی ورنہ اے ہمدم
اثر فریادِ دلہائے حزیں کا کس نے دیکھا ہے

میں ان کی صحت، درازئ عمر، کامرانی اور کامیابی کے لئے دعا کرتا ہوں۔

سرسیّد میموریل لیکچر

مجھے بے حد مسرّت ہے کہ سرسیّد میموریل لیکچر کا سلسلہ چند سال کے وقفہ کے بعد

شروع کیا جا رہا ہے اور قرعۂ فال میرے نام نکلا۔ ؎

قرعۂ فال بنامِ منِ دیوانہ زند

اگرچہ میں اپنی ہیچمدانی کی بنا پر اس ممتاز علمی اور ادبی لیکچر کے لئے اپنے آپ کو کسی طرح اہل نہیں سمجھتا۔ میرے لیکچر کا موضوع "اقبال اور قومی یک جہتی" ہے، جو ملک کے موجودہ اس نازک دور میں جبکہ ذات پات، فرقہ پرستی، لسانی عصبیت اور علاقائیت کے فتنے سر اُٹھا رہے ہیں، خصوصی توجہ کا مستحق ہے۔ علاوہ ازیں یہ ہفتہ ملک بھر میں "قومی یک جہتی ہفتہ" کے طور پر مادرِ ہند کی اس مایۂ ناز بیٹی کی یاد میں منایا جا رہا ہے جس نے قومی یک جہتی اور ملک کی سالمیت کے لئے اپنی جانِ عزیز تک قربان کر دی۔ آنجہانی اندرا گاندھی قومی یک جہتی کی جیتی جاگتی مثال تھیں ؎

آسماں تیری لحد پر شبنم افشانی کرے
سبزۂ نورستہ اس گھر کی نگہبانی کرے

سرسید احمد خاں ہمارے ملک کے معماروں میں ممتاز درجہ رکھتے ہیں۔ اگرچہ وہ ایک قدامت پسند معاشرہ میں پیدا ہوئے لیکن اپنی گہری بصیرت اور عصری مسائل کی آگہی سے انہوں نے اپنے دور کی بگڑی ہوئی حالت کا اندازہ لگا لیا اور اُن کی دور بیں نظروں نے دیکھا کہ ایک عہد ختم ہو رہا ہے اور ایک نیا عہد جنم لے رہا ہے۔ اقبال کے لفظوں میں انہوں نے اپنے ہم عصروں کو للکارا ؎

آفتابِ تازہ پیدا بطنِ گیتی سے ہوا
آسماں ڈوبے ہوئے تاروں کا ماتم کب تک

انہوں نے دیکھا کہ ملک کا ایک طبقہ قعرِ پستی میں گرتا جا رہا ہے، جس کا واحد سبب تعلیم کا فقدان ہے۔ وہ یہ بھی سمجھتے تھے کہ ملک اس وقت تک ترقی نہیں کر سکتا جب تک اس کے سب طبقے معاشی اور سماجی میدانوں میں شانہ بہ شانہ گامزن نہ ہوں اور یہ اُس

وقت تک ممکن نہ تھا جب تک ہر طبقہ تعلیم حاصل نہ کرے۔ چنانچہ ۱۸۷۶ء میں انہوں نے اس درس گاہ کی بنیاد رکھی۔ انہوں نے یہ درس گاہ قائم کر کے ملک پر ایک بہت بڑا احسان کیا کہ اس کی بدولت یہاں کے پسماندہ، غریب اور احساسِ کمتری کے شکار طبقہ کو نئے علوم سے اکتسابِ فیض کرنے کے وسایل نصیب ہوئے۔ اس معنی میں یہ درس گاہ اب ہمارے ملک کی ترقی کی راہ میں سنگ میل کا درجہ رکھتی ہے۔

آپ حضرات اُن کے حالاتِ زندگی اور اُن کے کارناموں سے بخوبی واقف ہیں۔ میں اُن کو کسی ایک طبقہ یا مذہب کے ماننے والوں کا رہنما نہیں سمجھتا۔ وہ ہندوستان کے ایک عظیم رہنما، ایک انقلابی مصلح، ایک ماہرِ تعلیم، ایک دانش ور، ایک عظیم اسکالر اور ایک صاحبِ طرز ادیب تھے۔ وہ ایک عہد ساز انسان تھے جو قرنوں اور صدیوں میں پیدا ہوتے ہیں۔ بقول شاعر ؎

مت سہل ہمیں جانو پھرتا ہے فلک برسوں
تب خاک کے پردے سے انسان نکلتے ہیں

سرسیّد اور اقبال

اقبال کا علی گڑھ سے خاص جذباتی رشتہ رہا۔ جب سرسیّد کا انتقال ہوا تو اقبال نے ان کی تاریخِ وفات

اِنّی متوفّیك و رافعك الیّ و مطهرك

نکالی۔

سرسیّد کے پوتے سر راس مسعود سے اقبال کے نہایت گہرے دوستانہ تعلّقات تھے۔ جب اقبال اس بیماری میں مبتلا ہوئے جو آخر کار مہلک ثابت ہوئی تو ۱۹۳۵ء میں سر راس مسعود نے ان کو بھوپال بلایا، جہاں وہ وزیرِ تعلیم تھے، اور نہ صرف ان کا باقاعدہ علاج کرایا بلکہ ان کے لئے ریاست بھوپال سے ۵۰۰ روپے ماہانہ

کی پنشن بھی منظور کرائی۔ پروفیسر رشید احمد صدیقی مرحوم نے اس واقعہ کے بارے میں لکھا ہے:[1]

"بھوپال کا تنہا یہ کارنامہ میرے نزدیک اُن کارناموں میں سے ہے
جن کو آئندہ آنے والی نسلیں کبھی فراموش نہ کرسکیں گی ....

....

اقبال کو غمِ روزگار سے نجات دلانا میرے نزدیک بڑی سعادت ہے"۔

سر راس مسعود کی وفات ہوئی تو اقبال کو سخت صدمہ ہوا اور انہوں نے وہ قطعہ جو اپنی قبر پر کندہ کرانے کے لئے لکھا تھا، سر راس مسعود کی لوحِ مزار کے لئے منتخب کیا اور وہی آج بھی رقم ہے ؎

نہ پیوستم دریں بستاں سرا دل ‏ ‏ ‏ زبندِ ایں وآں آزادہ رفتم
چو بادِ صبح گردیدم دمِ چند ‏ ‏ ‏ گلاں را رنگ و آبے دادہ رفتم

آپ میں سے اکثر حضرات فارسی ہیں جانتے ہوں گے۔ ان کے لئے میں اس کا ترجمہ پیش کر رہا ہوں۔

میں نے اس باغ میں دل نہیں لگایا اور ہر قسم کی بندش سے
آزاد ہو کر رخصت ہوا۔
جس طرح بادِ صبح چند لمحوں کے لئے چمن میں آکر، پھولوں کو
رنگ و آب دے کر چلی جاتی ہے۔

اقبال اور درس گاہ علی گڑھ

اس کے علاوہ بھی اقبال کا اس ادارہ سے خاص تعلقِ خاطر رہا۔ وہ یہاں کئی بار آئے۔ اسلام پر ان کے خطبات "The Reconstruction of Religious

---

[1] گنج ہائے گرانمایہ: ص ۱۸۳ ‏ ‏ [2] اقبال نامہ (حصہ اول): شیخ عطاء اللہ ص ۳۲۹

Thought In Islam جو انہوں نے مدراس مسلم ایسوسی ایشن کی دعوت پر مرتب کئے تھے، اُن میں سے تین خطبات ۱۹۲۹ء میں علی گڑھ میں بھی دئے گئے۔ اقبال غالباً آخری بار دسمبر ۱۹۳۴ء میں علی گڑھ آئے اور دو روز قیام کیا۔[1]

یہ درس گاہ وہ واحد ادارہ ہے جس کے طلباء کے نام اقبال نے ایک نظم لکھی ہے، "طلبۂ علی گڑھ کالج کے نام" (اس وقت تک کالج کو یونیورسٹی کا درجہ حاصل نہیں کیا تھا)۔ اس کے چند شعر آپ کو یاد دلانا چاہتا ہوں ؎

اوروں کا ہے پیام اور میرا پیام اور ہے | عشق کے درد مند کا طرزِ کلام اور ہے
طائرِ زیرِ دام کے نالے تو سُن چکے ہو تم | یہ بھی سنو کہ نالۂ طائرِ بام اور ہے
آتی تھی کوہ سے صدا، رازِ حیات ہے سکوں | کہتا تھا مورِ ناتواں لطفِ خرام اور ہے
موت ہے عیشِ جاوداں ذوقِ طلب اگر نہ ہو | گردشِ آدمی ہے اور گردشِ جام اور ہے
شمعِ سحر یہ کہہ گئی سوز ہے زندگی کا ساز | غمکدۂ نمود میں شرطِ دوام اور ہے

بادہ ہے نیم رس ابھی، شوق ہے نارسا ابھی
رہنے دو خُم کے سر پہ تم خشتِ کلیسیا ابھی

اُن کا یہ پیغام آج بھی طلبائے علی گڑھ کے لئے نہایت مناسب ہے۔

اقبال اُردو کا وہ واحد شاعر جس نے اپنے کلام اور پیام کے ذریعے نئی نسل کے فکر و نظر میں انقلاب پیدا کرنے کی کوشش کی۔ نوجوانوں کو اس کا پیغام یہ ہے کہ وہ عزم و ہمت، سعی و عمل، خودداری، بیباکی، آزادیٔ فکر و نظر اور اکلِ حلال کا جذبہ پیدا کریں تاکہ اُن کی زندگی مثالی زندگی ہو۔ گویا وہ Bible کی اس تعلیم کی طرف اشارہ کرتے ہیں:

---

[1] مکتوباتِ اقبال: سید نذیر نیازی ص ۲۳۵

"What will it avail a man

if he gains the whole world

but loses his own soul"

(اس سے کیا حاصل کہ آدمی پوری دنیا حاصل کرلے لیکن خود اپنی روح کھو بیٹھے۔)

انہوں نے اس پیغام کے لئے اپنے چہیتے بیٹے جاوید کو نوجوانوں کا Symbol (علامت) بنایا۔ یہ پیغام اُن کے ان مشہور اشعار میں نہایت پُرزور اور پُراثر انداز میں بیان ہوا ہے ؎

دیارِ عشق میں اپنا مقام پیدا کر — نیا زمانہ نئے صبح و شام پیدا کر
خدا اگر دلِ فطرت شناس دے تجھ کو — سکوتِ لالہ و گل سے کلام پیدا کر
اٹھا نہ شیشہ گرانِ فرنگ کے احساں — سفالِ ہند سے مینا و جام پیدا کر

یا ان اشعار میں:

اے طائرِ لاہوتی اُس رزق سے موت اچھی — جس رزق سے آتی ہو پرواز میں کوتاہی
آئینِ جواں مرداں حق گوئی و بے باکی — اللہ کے شیروں کو آتی نہیں رُوباہی

⁘

خودی کے نگہبان کو زہرِ ناب
وہ نان جس سے جاتی رہے اُس کی آب

"ضربِ کلیم" کی ایک نظم میں وہ ایک مثالی نوجوان کی تصویر ان الفاظ میں پیش کرتے ہیں ؎

وہی جواں ہے قبیلے کی آنکھ کا تارا — شباب جس کا ہے بے داغ ضرب ہے کاری
اگر ہو جنگ تو شیرانِ غاب سے بڑھ کر — اگر ہو صلح تو رعنا غزالِ تاتاری
نگاہِ کم سے نہ دیکھ اس کی بے کلاہی کو — یہ بے کلاہ ہے سرمایۂ کلہ داری

غالباً اُن کی یہ مشہور غزل بھی میرے خیال میں نوجوانوں ہی کو مخاطب کر کے لکھی گئی ہے ؎

ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں   ابھی عشق کے امتحاں اور بھی ہیں

موضوعِ سخن

عہدِ حاضر میں اقبالؔ برِصغیر ہند و پاک کا اردو اور فارسی کا عظیم ترین شاعر ہے۔ وہ ہماری مشترکہ میراث ہے لیکن یہ ایک نہایت دردناک المیہ ہے کہ آزادی کے بعد ہندوستان نے اقبالؔ کو طاقِ نسیاں کی زینت بنا دیا۔ اس لیے کہ ان کے آخری زمانے کے بعض بیانات و خطبات کی تشریح اس طرح کی گئی گویا وہ نظریہ پاکستان کے خالق ہیں۔ بہر کیف ۱۹۷۰ء کے بعد اقبالؔ نے گویا اس ہندوستان میں دوبارہ جنم لیا جسے وہ " سارے جہاں سے اچھا " کہتے ہیں۔ گذشتہ دو تین برسوں میں ہمیں نے بھی اقبالؔ کو Reinstate یا Reinstall کرنے کی حقیر کوشش کی ہے تاکہ غلط فہمیوں کے گرد و غبار سے نکل کر وہ ہمارے مجمعِ شعراء میں اسی طرح ضوپاش ہونے لگیں، جیساکہ انہیں ہونا چاہیئے۔ مَیں یہاں اس بات کا اعتراف کرنا چاہتا ہوں کہ مَیں کلامِ اقبالؔ کا ایک نہایت ادنیٰ طالبِ علم ہوں اور نہ مجھے اپنی علمیت کا دعویٰ ہے اور نہ ادیب و نقاد ہونے کا مغالطہ۔ مجھے تو اس عظیم شاعر کو دیکھنے کی سعادت بھی حاصل نہ ہوئی۔ ایک پاکستانی شاعر نے اپنے ایک شعر میں میرے محسوسات کی ترجمانی بڑی خوبی سے کی ہے، جسے ذرا سے تصرّف کے ساتھ پیش کر رہا ہوں ؎

میں وہ بدبخت کہ جو تیرے زمانہ میں نہ تھا
تو وہ خوش بخت کہ جو میرے زمانہ میں نہیں

مادرِ وطن سے محبّت

اقبالؔ بڑے پکّے محبّ الوطن، مذہبی رواداری کے پرزور حامی اور ہندوستانی

مفکّروں اور سنتوں کے مدح خواں تھے۔ اسلام سے اپنی گہری وابستگی کے باوجود انہوں نے ہندی فکر و فلسفہ کا نہایت گہرا مطالعہ کیا ہے اور اس کی اصل روح سے وہ متاثر ہوئے تھے۔ مادرِ وطن کی محبت ہی قومی یک جہتی کی بنیاد ہے۔ اقبالؔ نے اپنی شاعری کے دورِ اولین میں چند بہت ہی متاثر کرنے والی اور جذبۂ حبِ وطن سے بھرپور نظمیں لکھی ہیں مثلاً "ہمالہ" "ہندوستانی بچوّں کا قومی گیت" "ترانۂ ہندی" اور "نیا شوالہ"۔ "ترانۂ ہندی" اُن کی وطن پرستانہ شاعری کا اعلیٰ ترین نمونہ ہے۔ اگر ہندوستان کی تقسیم کا المیہ پیش نہ آیا ہوتا تو مجھے یقین ہے کہ یہ نظم ہمارے ملک کا قومی ترانہ بن گئی ہوتی۔

۱۹۳۸ء میں رسالہ "جوہر" (دہلی) کے خصوصی اقبالؔ نمبر کے لیے ایڈیٹر کے نام ایک خط میں مہاتما گاندھی نے 'ترانۂ ہندی' کی تعریف لکھی تھی۔ یہ خط انہوں نے اردو میں لکھا تھا۔ اُن کے لفظوں میں:

"آپ کا خط ملا۔ ڈاکٹر اقبالؔ مرحوم کے بارے میں کیا لکھوں؛ لیکن میں اتنا تو کہہ سکتا ہوں کہ جب ان کی مشہور نظم 'ہندوستاں ہمارا' پڑھی تو میرا دل بھر آیا اور بڑودا جیل میں تو سینکڑوں بار میں نے اس نظم کو گایا ہوگا۔ اس نظم کے الفاظ مجھے بہت ہی میٹھے لگے اور یہ خط لکھتا ہوں، تب بھی وہ نظم میرے کانوں میں گونج رہی ہے۔"

ہندوستان[1] کو آزادی ملنے پر بھی گاندھی جی نے اس ترانے کو نہیں بھلایا۔ ۲۱ر اگست ۱۹۴۷ء کو نواکھالی (یہ اب بنگلہ دیش میں ہے۔) کے ایک گاؤں میں جہاں ہندوستان اور پاکستان کے قومی پرچم ساتھ ساتھ لہرا رہے تھے، گاندھی جی

---

[1] Mahatma : G. D. Tendulkar Vol. III, P. 109

بہ حوالہ "جادوگرِ ہندی نژاد": عتیق صدیقی ص ۱۴۱

کی پرارتھنا سبھا میں یہی ترانہ گایا گیا تھا۔ سبھا کے آخر میں گاندھی جی نے ؎

مذہب نہیں سکھاتا آپس میں بیر رکھنا

دہراتے ہوئے دعا کی تھی کہ ہم آئندہ مسائل کو حل کرنے کے لئے کبھی تلوار نہ اٹھائیں۔

یہاں یہ ذکر کرنا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ 'دوردرشن' کی نئی علامتی دُھن جو پنڈت روی شنکر نے بنائی ہے وہ اسی نظم پر مبنی ہے اور اسے خود شہیدِ وطن شریمتی اندرا گاندھی نے پسند کیا تھا۔ یہ ۷۶-۱۹۷۵ء کی بات ہے جب میں وزارتِ اطلاعات و نشریات کا سکریٹری تھا۔ اصل میں یہ تجویز بھی خود شریمتی اندرا گاندھی مرحومہ کی ہی تھی کہ 'دوردرشن' کی نئی علامتی دُھن اس قومی گیت پر بنائی جائے۔

اسی طرح کی نظم 'نیا شوالہ' میں جذبۂ حب الوطنی کو ایک تابناک اظہار ملا ہے جس میں وہ کہتے ہیں ؎

خاکِ وطن کا مجھ کو ہر ذرّہ دیوتا ہے

فرقہ وارانہ نااتفاقی پر غم و اندوہ

مسلسل فرقہ وارانہ اختلافات نے اقبالؔ کے دل و دماغ میں گہرا غم و اندوہ پیدا کر دیا تھا۔ جو ان کی نظم 'صدائے درد' میں جھلک رہا ہے۔ وہ کہتے ہیں ؎

جل رہا ہوں، کل نہیں پڑتی کسی پہلو مجھے　　ہاں ڈبو دے اے محیطِ آبِ گنگا تو مجھے

سرزمیں اپنی قیامت کی نفاق انگیز ہے　　وصل کیسا یاں تو اک قربِ فراق آمیز ہے

اقبالؔ کا ایمان تھا کہ مذہب بنیادی طور پر ایک اتحاد پیدا کرنے والی قوت ہے۔ 'ترانۂ ہندی' کا یہ شعر تو اب ضرب المثل بن گیا ہے ؎

مذہب نہیں سکھاتا آپس میں بیر رکھنا

ہندی ہیں ہم وطن ہے ہندوستاں ہمارا

اقبال کا عقیدہ تھا کہ اگر اکبر کا دینِ الٰہی اور کبیر کی تعلیمات عوام کو اپنی گرفت میں لے لیتیں تو ذات پات اور فرقوں کے اختلافات بڑی حد تک کم ہو جاتے۔ آل انڈیا مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس میں جو ۲۹ دسمبر ۱۹۳۰ء کو الہ آباد میں منعقد ہوا تھا، انہوں نے اپنے مشہور خطبۂ صدارت میں کہا تھا:

رینان[۱] (Renan) کہتا ہے کہ انسان کو نہ اس کی نسل غلام بناتی ہے نہ مذہب، نہ وہ دریاؤں کے بہاؤ یا کوہسار کے سلسلوں میں محصور ہوتا ہے بلکہ لوگوں کی ایک بڑی جماعت جو عقلِ سلیم اور دلِ بیدار کی مالک ہو، ایک ایسا اخلاقی شعور پیدا کر دیتی ہے جسے ہم 'قوم' کہتے ہیں۔ اگر کبیر کی تعلیمات یا اکبر کے دینِ الٰہی کی گرفت اس ملک کے عوام کے ذہنوں تک پہنچ گئی ہوتی تو یہ تصور (قومیت کا تصور) ہندوستان میں ایک حقیقت بن کر اُبھر سکتا تھا۔"

اقبال خوب جانتے ہیں کہ تمام سامراجی قوتیں "لڑاؤ اور حکومت کرو" کی پالیسی پر چل کر زندہ رہتی ہیں۔ اس لیے وہ اپنے ہم وطنوں کو آگاہ کرتے ہیں کہ مختلف فرقوں میں موجودہ اور روز افزوں جھگڑے صرف اُن سامراجی طاقتوں کے ہاتھ مضبوط کر رہے ہیں، جو ہندوستان پر اپنا اقتدار جمائے ہوئے ہیں۔ اپنی نظم 'تصویرِ درد' میں وہ ان تمام آزاروں کا تجزیہ کرتے ہیں جن میں اُس وقت ہماری سوسائٹی مبتلا تھی۔ اور اُن اسباب کی نشان دہی کرتے ہیں جنہوں نے قومی یک جہتی کے عمل میں رکاوٹ پیدا کی ہے۔

وہ اپنے ہم وطنوں کو للکارتے ہیں اور خبردار کرتے ہیں کہ وہ شاندار ماضی کی

---

[۱] مشہور فرانسیسی مفکر جس کا وہ مشہور مضمون what is a Nation ? ۱۸۸۲ء میں شائع ہوا جس کا اقتباس علامہ اقبال نے دیا ہے۔

پُر فریب داستانوں میں نہ کھو جائیں بلکہ زمانۂ حال کا شعور پیدا کریں اور مستقبل کے انداز کو سمجھنے کی کوشش کریں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ اس ملک کی مایوس کُن حالت محض آنسو بہانے سے نہیں سنورے گی ؎

رُلاتا ہے ترا نظّارہ اے ہندوستاں مجھ کو ۔۔۔ کہ عبرت خیز ہے تیرا فسانہ سب فسانوں میں

وطن کی فکر کر ناداں مصیبت آنے والی ہے ۔۔۔ تری بربادیوں کے مشورے ہیں آسمانوں میں

انہیں یقین ہے کہ ہمارا جذبۂ اتحاد ہی عالمی اخوت کی بنیاد بھی بن سکتا ہے۔ اسی محبت کو وہ فاتحِ عالم کہتے ہیں۔ طبقات اور فرقوں کے جھگڑوں نے قوموں کو ہلاک کیا ہے۔ وہ اس کا ماتم کرتے ہیں کہ ان کے ہم وطنوں کو اِس ملک کی بھلائی کا ذرا بھی پاس نہیں ہے ؎

اُجاڑا ہے تمیزِ ملت و آئیں نے قوموں کو ۔۔۔ مرے اہلِ وطن کے دل میں کچھ فکرِ وطن بھی ہے

محبت ہی سے پائی ہے شفا بیمار قوموں نے ۔۔۔ کیا ہے اپنے بختِ خفتہ کو بیدار قوموں نے

٭

جو تو سمجھے تو آزادی ہے پوشیدہ محبت میں ۔۔۔ غلامی ہے اسیرِ امتیازِ ما و تو رہنا

نظریۂ قوم پرستی سے بیزاری

اپنی شاعری کے دوسرے دور میں جو ۱۹۰۵ء سے ۱۹۰۸ء تک ان کے یورپ میں قیام کا زمانہ بھی ہے، ان کے نظریۂ قوم پرستی میں زبردست تبدیلی ہوتی ہے۔ جو یورپ میں ان کے مشاہدات کا نتیجہ ہے۔ انہوں نے بڑی دہشت کے ساتھ دیکھا کہ کس طرح حبّ الوطنی کی لَے حد سے بڑھ کر جنگ جوئی اور جارحیت میں بدل گئی اور اس کے نتیجے میں خود مختار اور طاقتور قومی ریاستیں یورپ میں پیدا ہوئیں۔ پھر اقتدار کے لیے خصوصاً اور وسیع تر جدید نوآبادیوں پر قبضہ کرنے کے لیے عموماً ان قوموں میں سخت رقابت شروع

ہوگئی ۔ ان قوموں پر یہ شیطنت بھی سوار تھی کہ چھوٹی اور کمزور قوموں کو اپنا محکوم بنالیں ۔ انہوں نے یہ نتیجہ نکالا کہ قوم پرستی کا محدود نظریہ مختلف ملکوں میں اس تصادم کو بڑھانے کا ذمہ دار ہے اور مستقبل کے لیے یہ کوئی اچھا شگون نہیں ہے ۔ وہ کہتے ہیں ؎

ان تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے
جو پیرہن اس کا ہے وہ مذہب کا کفن ہے

چنانچہ یہ حالات تھے جنہوں نے اقبالؔ کو نظریہ قوم پرستی سے بالکل بدل کردیا اور وہ ایک ایسے بین الاقوامی نظام کے متلاشی ہوئے جو بلند اور شریفانہ اَقدار پر مبنی ہو۔ انہوں نے سوچا کہ اِس نئے سماجی نظام کے لیے اسلام ایک خاکہ پیش کرتا ہے مگر حالات اب یہ ظاہر کرتے ہیں کہ یہ امید بھی پُر فریب تھی ۔ اقبالؔ دیکھنے کے لیے زندہ ہوتے تو اُن کی یہ امید کہ ساری انسانیت اسلام کے نام پر متحد ہوسکتی ہے ، ہمارے زمانے میں مسلسل جاری رہنے والی ایران، عراق جنگ سے ہی پارہ پارہ ہوگئی ہوتی ۔ انہوں نے سوچا کہ اگر جذبۂ حب الوطنی کو بلند مقاصد کے لیے استعمال نہیں کیا جاتا تو یہ کمزور اقوام کے استحصال کا سبب بھی بن سکتا ہے ۔ شاید اسی لیے ڈاکٹر جانسن نے کہا تھا :

"حبّ الوطنی ایک پاجی آدمی کی آخری پناہ گاہ ہے "

وطن سے اُلفت کے ساتھ ساتھ انہوں نے اپنی مذہبی وراثت سے بھی قلبی لگاؤ کا اظہار کیا ۔ اسلام سے محبت ، اسلامی نظریۂ حیات سے گہری عقیدت اور اسلامی اقدار کی پاسبانی پر توجہ نے انہیں بلادِ اسلامیہ سے محبت کی ترغیب دی ۔ بعض ناقدین یہ اعتراض کرتے ہیں کہ اس دور میں اسلام ہی اقبالؔ کی شاعری کا محور بن گیا تھا ۔ نیز یہ کہ اُن کے جذبۂ وطن پرستی پر ان کی اسلام دوستی غالب آگئی تھی لیکن وہ اس اہم نکتے کو نہ جانے کیوں فراموش کرجاتے ہیں کہ اسلام کے عقیدہ و اعمال کی پاسداری میں اقبالؔ کے یہاں کہیں بھی حبِّ وطن سے بے نیازی ظاہر نہیں ہوتی ؎

ہے اگر قومیتِ اسلام پابندِ مقام
ہند ہی بنیاد ہے اس کی نہ فارس ہے نہ شام

وطن پرستی اور قوم پرستی میں فرق

اس سلسلے میں خواجہ غلام السیدین نے اپنے مقالے "Progressive Trends In Iqbal's Thought" میں وطن پرستی (Patriotism) اور قوم پرستی (Nationalism) میں ایک بڑے لطیف امتیاز کی طرف اشارہ کیا ہے کہ اقبال محدود قوم پرستی (Narrow Nationalism) کے خلاف تھے لیکن وہ وطن پرستی (Patriotism) کے خلاف نہیں تھے :

" اقبال کی شاعری اور فلسفے نے خود کو جغرافیائی حدود میں بند رکھنے سے ہمیشہ ہی انکار کیا ۔ ان کی شاعری اور فلسفہ تمام انسانیت کے ماضی ، حال اور مستقبل کا احاطہ کرتے ہیں ۔ اقبال نے اپنی ساری زندگی ایک عظیم تہذیبی اور روحانی جدوجہد کو حقیقی معنویت دینے کے لیے وقف کردی ۔ یہ وہ معرکہ ہے جو انسانی تاریخ میں ہمیشہ جاری رہا ہے ۔

اقبال کی طرح رسل (Bertrand Russell) ویلز (H. G. wells) شا (George Bernard Shaw) اور جوڈ (C. E. M. Joad) جیسے مفکرین اور سوشلسٹ جیسی سیاسی پارٹیوں کے نظریات میں بنیادی فرق یہ ہے کہ وہ انسانی سماج کے اس نظریہ ہی کو غلط سمجھتے ہیں ، جس کی بنیاد قوم پرستی پر ہو .... قوم پرستی کے اس محدود تصوّر سے تو باہمی کش مکش اور تجارتی رقابت بڑھے گی ، جنگیں زیادہ ہوں گی اور استحصال عام ہو جائے گا .... اس کے برخلاف اقبال کے نظریہ کی بنیاد

انسان دوستی اور اخلاقی، مذہبی، روحانی اقدار سے محبت پر استوار ہے۔ ان کا خیال تھا کہ کوئی بھی نظریہ جو باہمی استحصال اور نفرت پر مبنی ہو، انسانیت کی بنیادی قدروں کو نہیں پہچان پائے گا اور وہ انسان کے روحانی کردار کی نشو و نما میں رکاوٹ بن جائے گا۔ اسی کا اقبالؔ نے اس شعر میں اظہار کیا ہے ؎

ہوس نے کر دیا ہے ٹکڑے ٹکڑے نوعِ انساں کو
اخوت کا بیاں ہو جا، محبت کی زباں ہو جا! [۱]

اس سلسلہ میں یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ اقبالؔ کے ہم عصر اور عظیم شاعر رابندر ناتھ ٹیگور بھی محدود نظریۂ قوم پرستی کے مخالف تھے۔ چنانچہ اس موضوع پر ان کی تحریر کا اقتباس ملاحظہ ہو:

"تاریخِ انسانی کی منزلِ مقصود نہ بین الاقوامیت کا بے رنگ ابہام ہے نہ قوم پرستی کی خود ساختہ بندگی .... اور ہندوستان ایک طرف اختلافات کے سماجی ضابطے بنا کر اور دوسری طرف وحدت کو روحانی طور پر تسلیم کر کے اپنے کام کی تکمیل کرتا رہا ہے۔ اس نے بہت سختی کے ساتھ قوموں کے درمیان حد بندی کی دیوار کھینچ کر اور اس درجہ بندی سے پیدا ہونے والے احساسِ کمتری کو پائندہ رکھ کر شدید غلطیاں کی ہیں .... اُپنشدوں کے ابتدائی زمانہ سے لیکر آج تک عظیم روحانی معلّموں کی ایک جماعت نے اسی یقین کے حصول کے لئے کام کیا ہے۔ ان کا ایک ہی مقصد رہا ہے کہ انسان کے

---

[۱] Iqbal as a thinker : Eminent Scholers p-58-64

تمام اختلافات کو ہمارے شعورِ الوہیت کے دھارے میں بہاکر معدوم کردیں[1]

بین الاقوامی وطنیت

بنیادی طور پر اقبالؔ کو ایک ایسے بین الاقوامی نظام کی تمنا تھی جو اخوت اور اتحادِ بشری، ہم آہنگی اور قوموں کے باہمی امن و آشتی پر استوار ہو اور جس میں عظمتِ انسانی کا بول بالا ہو۔ جہاں اخوت کی فراوانی اور محبت کی عالمگیری ہو۔ یہی وہ مقام ہے جہاں وہ آفاقی قدروں کے ترجمان بن جاتے ہیں۔ ان کی اِس آفاقیت کو ہم بین الاقوامی وطنیت کا نام دے سکتے ہیں[2]۔

کریں گے اہلِ نظر تازہ بستیاں آباد — مری نگاہ نہیں سوئے کوفہ و بغداد

٭

درویشِ خدامست نہ شرقی ہے نہ غربی — گھر میرا نہ دلّی، نہ صفاہاں، نہ سمرقند

جذبۂ حبّ الوطنی کا اظہار دورِ آخر کے کلام میں

اگرچہ انہوں نے قومیت کے عقیدہ کو ترک دیا تھا مگر اپنے وطن کے لیے اُن کی محبت میں کوئی کمی نہیں آئی تھی۔ چنانچہ دورِ آخر کے کلام میں بھی حبّ الوطنی کا گہرا جذبہ جھلک رہا ہے۔ اُن کا شاہکار "جاوید نامہ" جو دانتے (Dante) کی "طربیۂ خداوندی"

---

[1] 1-A Tagore Reader : Edited by Amiya Chakraverty, Beacon Press, Boston

[2] اقبالؔ کا تصورِ وطنیت : ڈاکٹر مجید بیدار (زبان و ادب ، جنوری۔ مارچ ۸۴ء ص ۹۵)

(Divine Comedy) کے انداز پر لکھا گیا ہے، پہلی بار ۱۹۳۲ء میں فارسی میں شائع ہوا۔ اس میں جذبۂ حب الوطنی کا خوبصورت اظہار ملتا ہے۔

اس نظم میں وہ اپنے مرشد عظیم صوفی شاعر رومی کے ساتھ افلاک کی سیر کرتے ہیں اور وہاں نواحِ جنت میں سب سے پہلے ان کی ملاقات وشوامتر سے ہوتی ہے جو ایک ہندوستانی سنت ہے اور جسے اقبالؔ 'جہاں دوست' کے لقب سے یاد کرتے ہیں (یہ وشوامتر کا لفظی ترجمہ ہے)۔[1] ایک روایت کے مطابق وشوامتر سلطنتِ قنوج کا سپہ سالار تھا مگر وہ ایک سادھو، ایک مفکر اور علوم کی سرپرستی کرنے والا بھی تھا۔ اُسے اپنے زبردست علم وفضل کی وجہ سے شہرت نصیب ہوئی۔ نیز وسیع اور متنوع معلومات اور گیان دھیان کی وجہ سے 'راج رشی' اور 'برہم رشی' کے القاب بھی ملے۔ کہا جاتا ہے کہ وہ رام کا اتالیق تھا۔

اسی نظم میں 'جہاں دوست' (وشوامتر) ایک فرشتے سے اپنی ملاقات کا ذکر کرتے ہیں جس میں وہ فرشتہ مشرق کے بیدار ہونے کی بشارت دیتا ہے ؎

گفت ہنگامِ طلوعِ خاور است
آفتابِ تازہ اُورا در بَر است

(اس نے کہا کہ یہ مشرق کے بیدار ہونے کا وقت ہے۔ اور ایک نیا سورج اس کے پہلو میں ہے۔)

رستخیزے درکنارش دیدہ ام
لرزہ اندر کوہسارش دیدہ ام

(میں نے اس کے آغوش میں ایک ہنگامہ اور اس کے کہساروں میں

---

[1] مقامِ اقبالؔ : اشفاق حسین

لرزہ دیکھا ہے۔)

عرشیاں را صبحِ عید آں ساعتے
چوں شود بیدار چشمِ ملّتے

(اہل آسمان کے لئے وہ صبحِ عید کی ساعت ہوگی، جب ایک قوم
خوابِ غفلت سے اپنی آنکھیں کھولے گی۔)

ان الفاظ میں اقبال نے اس تمنّا کا بڑا لطیف اظہار کیا ہے کہ وہ اپنے ملک
کو آزاد دیکھنا چاہتے تھے۔

اس نظم میں اقبال نے ہندوستان کی روح کا خوبصورت رُوپ بھی بیان کیا
ہے لیکن اس کے گہرے دکھ سے سخت متاثر ہوئے ہیں۔ ؎

با چنیں خوبی نصیبش طوق و بند
بر لبِ او نالہ ہائے دردمند

(اتنی خوبیوں کے باوجود اس کی قسمت میں غلامی کی زنجیریں ہیں
اور اس کے لبوں پر دردمند نالے ہیں)

روحِ ہندوستان کی اس فغانِ درد میں اقبال کے خونِ جگر کی جھلک صاف
نظر آتی ہے۔ وہ اس پر بھی اپنے رنج کا اظہار کرتے ہیں کہ اس ملک کے باشندوں
کو اپنے ملک کی آبرو کا احساس نہیں ہے۔ ؎

شمعِ جاں افسردہ در فانوسِ ہند
ہندیاں بیگانہ از ناموسِ ہند

(ہندوستان کے فانوس میں شمعِ جان بجھی بجھی سی ہے اور ہندوستانی
اپنے ملک کی عزت و ناموس سے بیگانہ ہیں)

وطن سے غداری

اقبالؔ کا ایمان تھا کہ اپنے وطن سے غداری سب سے زیادہ گھناؤنا جرم ہے جو کسی سے سرزد ہوسکتا ہے۔ اقبالؔ کہتے ہیں کہ بنگال کا میر جعفر اور دکن کا میر صادق دونوں صرف انسانیت کے لئے بلکہ ملک اور مذہب کے لئے بھی باعثِ ننگ ہیں۔ ؎

جعفر از بنگال و صادق از دکن
ننگِ آدم، ننگِ دیں، ننگِ وطن

اقبالؔ کی مثنوی "پس چہ باید کرد اے اقوامِ شرق" میں (جو اُن کی وفات سے دو سال قبل ۱۹۳۶ء میں چھپی تھی۔) ایک نظم کا عنوان "اشکے چند بر افتراقِ ہندیاں" ہے، اس میں وہ کہتے ہیں۔ ؎

ہندیاں با یک دگر آویختند
فتنہ ہائے کہنہ باز انگیختند

(ہندوستانی آپس ہی میں لڑنے اور (اختلاف کے) گڑے مُردے اکھاڑنے لگے۔)

تا فرنگی قومے از مغرب زمیں
ثالث آمد در نزاعِ کفر و دیں

(یہاں تک کہ مغرب سے قوم فرنگی اس کفر و دین کے جھگڑے میں ثالث بن کر آدھمکی۔)

مزید برآں اُن کے اُردو شاعری کے آخری مجموعہ "ضربِ کلیم" میں دو نظمیں ملتی ہیں "گلہ" اور "شعاعِ امید" جن میں وطن کی محبت کے لیے ان کا دل دھڑک رہا ہے۔ وہ اپنی نظم بہ عنوان "گلہ" میں کہتے ہیں۔ ؎

معلوم کسے ہند کی تقدیر کہ اب تک
بے چارہ کسی تاج کا تابندہ نگیں ہے

دہقاں ہے کسی قبر کا اُگلا ہوا مُردہ
بوسیدہ کفن جس کا ابھی زیر زمیں ہے

جاں بھی گروِ غیر، بدن بھی گروِ غیر
افسوس کہ باقی نہ مکاں ہے نہ مکیں ہے

یورپ کی غلامی پہ رضا مند ہوا تو
مجھ کو تو گلہ تجھ سے ہے یورپ سے نہیں ہے

دوسری نظم "شعاعِ امید" ہے جس کا مرکزی خیال بھی ہندوستان ہی ہے۔ اس وقت بھی اقبالؔ یہ سمجھتے تھے کہ ہندوستان کی جغرافیائی وحدت ناقابلِ تقسیم ہے، اسی طرح زندگی کی بعض بنیادی قدریں بھی۔ ؎

اک شوخ کرن، شوخ مثالِ نگہِ حور
آرام سے فارغ صفتِ جوہرِ سیماب

بولی کہ مجھے رخصتِ تنویر عطا ہو
جب تک نہ ہو مشرق کا ہر اک ذرہ جہانتاب

چھوڑوں گی نہ میں ہند کی تاریک فضا کو
جب تک نہ اٹھیں خواب سے مردانِ گراں خواب

خاور کی امیدوں کا یہی خاک ہے مرکز
اقبالؔ کے اشکوں سے یہی خاک ہے سیراب

بُت خانے کے دروازہ پہ سوتا ہے برہمن
تقدیر کو روتا ہے مسلماں تہِ محراب

مشرق سے ہو بیزار نہ مغرب سے حذر کر
فطرت کا اشارہ ہے کہ ہر شب کو سحر کر

حقیقت تو یہ ہے کہ آخری عمر میں ہندوستان سے ان کا لگاؤ اور بھی گہرا ہو گیا تھا۔ اُن کے آخری مجموعۂ کلام "ارمغانِ حجاز" میں بھی وطن کی محبت اور اس کو آزاد دیکھنے کی خواہش کا اظہار موجود ہے۔ "ارمغانِ حجاز" کا یہ شعر ملاحظہ ہو۔ ؎

شبِ ہندی غلاماں را سحر نیست
بایں خاک آفتابے را گذر نیست

(ہندی غلاموں کی شبِ تاریک سحر آشنا نہیں ہے۔ گویا اس

سرزمین پر آفتاب کا گذر ہی نہیں ہوتا۔)

یہ علامہ کے اسی باطنی کرب کی عکاسی کرتا ہے۔

اپنی وفات سے صرف پانچ ہفتے پہلے مارچ سنہ ۱۹۳۸ء میں اقبال نے مولانا حسین احمد مدنی سے مسئلہ قومیت پر بحث کے دوران اپنے 'ہندوستانی' ہونے کا اظہار کرتے ہوئے قومیت کے بارے میں اپنے نظریات کا یوں اظہار کیا تھا:

"ہزاروں لاکھوں برس سے قومیں ملکوں سے اور ملک قوموں سے وابستہ رہے ہیں۔ ہم سب ہندوستانی کی حیثیت سے پہچانے جاتے ہیں .... مادرِ وطن، کا تصوّر ایک جغرافیائی اصطلاح ہے اور یہ اسلام کے خلاف نہیں ہے۔ دوسرے لفظوں میں ہر شخص فطری طور پر اپنے زاد بوم سے محبت کرتا ہے اور اس کے لئے اپنے مقدور بھر قربانی دینے پر آمادہ رہتا ہے"[1]

اقبال اور ہندوستانی مفکرین

اقبال ہندوستانی ادب میں ایک منفرد شخصیت ہیں۔ وہ نہ صرف ایک عظیم شاعر بلکہ ایک عظیم مفکر بھی ہیں۔ ایک مفکر کی حیثیت سے انہوں نے مغربی فلسفیوں کا گہرا مطالعہ کیا۔ ساتھ ہی انہوں نے مسلمان مفکرین کے خیالات کو

1-The Poet of The East : Abdulla Anwar Beg

"ملّت اور وطن"..... مولانا حسین احمد مدنی اور علامہ اقبال کی بحث ص ۱۹

بھی جذب کیا۔ مزید براں وہ ہندوستانی سنتوں اور مفکروں سے بھی بہت متاثر تھے۔

ویدوں کا اشلوک

اپنی شاعری کے عہدِ اولین میں اقبالؔ نے ویدوں کے ایک اشلوک کو بھی اُردو میں نظم کیا تھا جو افسوس ہے کہ ان کے کسی مجموعہ میں شامل نہیں ہے مگر اقبالؔ کی سوانح عمری " روزگار فقیر " میں ملتا ہے۔ ؎

خویشوں سے ہو اندیشہ نہ غیروں سے خطر ہو — احباب سے کھٹکا ہو نہ اعدا سے حذر ہو
روشن مرے سینے میں محبت کا شرر ہو — دل خوف سے آزاد ہو بے باک نظر ہو

پہلو میں مرے دل ہو مے آشامِ محبت
ہر شے ہو مرے واسطے پیغامِ محبت

یہ اتھر وید کے ایک اشلوک سے ماخوذ ہے۔

اپنشدوں کا اثر

پروفیسر انا میری شمل Anna Marie Schimmel نے لکھا ہے کہ

" بالِ جبریل" اور " زبورِ عجم" کے مندرجہ ذیل اشعار کے بنیادی زاویۂ فکر پر اپنشدوں کا اثر معلوم ہوتا ہے[1]

ایں جہاں چیست صنم خانۂ اسرارِ من است
جلوۂ او گرو دیدۂ بیدارِ من است

(یہ دنیا کیا ہے ؟ میرے ہی پندار کا صنم خانہ ہے اور اس کا جلوہ

1-Gabriel's Wing : Anna Marie Schimmel p-345

میسر دیدۂ بیدار کا مرہون ہے ۔)

خودی کیا ہے؟ رازِ درونِ حیات
خودی کیا ہے؟ بیداریٔ کائنات

بدھ مت

علامہ اقبال نے گوتم بدھ کو پیغمبروں میں شمار کرتے ہوئے تمام مذاہب کی برگزیدہ شخصیتوں کی تعظیم کا ثبوت دیا ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ گوتم بدھ کی رُہبانیت انسانی بنیادوں پر قائم ہے۔ اس سے انسانوں کی غم خواری کا سبق ملتا ہے۔ "جاویدنامہ" میں 'زندہ رود' (اقبال) کی ملاقات گوتم بدھ سے وادیٔ طواسین میں ہوتی ہے۔ گوتم بدھ حیات و ممات، جزا و سزا، حسن کردار و حسن خیال کو نہایت دلنشیں انداز میں سمجھاتے ہیں ؎

بگذر از غیب کہ ایں وہم و گماں چیزے نیست
در جہاں بودن و رُستن ز جہاں چیزے ہست

(غیب کے چکّر میں مت پڑو۔ یہ وہم و گمان کچھ نہیں، البتہ دنیا میں رہ کر اس سے آزاد رہنا ایک بات ہے۔)

آں بہشتے کہ خدائے بتو بخشد ہمہ ہیچ
تا جزاے عملِ تست جناں چیزے ہست

(وہ بہشت جو تجھے تیرا خدا بخشتا ہے، سب ہیچ ہے۔ ہاں اگر جنت تیرے عمل کی جزا کے طور پر ملے تو ایک بات بھی ہے۔)

راحتِ جاں طلبی؟ راحتِ جاں چیزے نیست
درغمِ ہم نفساں اشکِ رواں چیزے ہست

(تم روح کا سکون چاہتے ہو۔ سکونِ روح کوئی چیز نہیں۔ ہاں اپنے

ساتھیوں کے غم میں آنسو بہانا ہی سب کچھ ہے۔)

گایتری

اقبال کے سوانح نگار عبدالمجید سالک کا بیان ہے کہ اقبال نے سنسکرت بھی پڑھی تھی۔ اس کی تائید عطیہ فیضی نے بھی کی ہے۔ ان کی ابتدائی دور کی نظموں میں سے ایک 'گایتری' سے ماخوذ ہے۔ جو ہندوؤں کا مقدس منتر ہے۔ جب یہ نظم ۱۹۰۲ء میں پہلی بار "مخزن" میں شائع ہوئی تو اس کے ساتھ اقبال کا ایک تمہیدی نوٹ بھی تھا۔ منتر کا پس منظر بیان کرتے ہوئے اس نوٹ میں تحریر تھا:

"....... قدیم قوموں اور صوفیائے اسلام نے بھی خدا کے وجود کو 'نور' کہا ہے۔ قرآن پاک میں ارشاد ہے" اللہ نور السمٰوات والارض"۔ 'گایتری' جو کہ شیرینی اور نغمگی سے بھرپور حرف وصوت کا بے مثل مرقع ہے، تقریباً ناقابلِ ترجمہ ہے۔ ان دشواریوں کے پیشِ نظر اس کا ترجمہ 'سوریہ نرائن اپنشد' میں مندرج وضاحت پر مبنی ہے۔ میرے اشعار اچھے ہیں تاہم میری نظم کو 'گایتری' نہیں کہا جا سکتا"

اے آفتاب روح و روانِ جہاں ہے تو
شیرازہ بندِ دفترِ کون و مکاں ہے تو

بھگوت گیتا کا فلسفۂ عمل

اقبال بھگوت گیتا کے فلسفۂ عمل سے بھی بہت متاثر تھے۔ گیتا میں آتما (خودی) کو لافانی کہا گیا ہے اور عمل کو جزا و سزا کی لاگ کے بغیر زندگی کا اعلیٰ ترین نصب العین بتایا ہے۔ اس کی بنیادی تعلیم یہ ہے کہ صلہ کی پروا کیے بغیر عمل کرنا چاہیئے۔ عمل میں

انسان کا یہ مکمل تیاگ (ترک خواہش) روح کو فرحت بخشتا ہے اور اسے ابدی روح (ہستی مُطلق) سے ہمکنار کر دیتا ہے۔ اقبالؔ کے فلسفۂ عمل کے کردار کی تشکیل میں بھگوت گیتا کا اثر کارفرما نظر آتا ہے۔ گو اس کا سرچشمہ اسلام کی تعلیمات ہیں۔ ان کے پیغامِ عمل پر بہت سے مشہور شعر ہیں ؎

عمل سے زندگی بنتی ہے جنت بھی جہنم بھی
یہ خاکی اپنی فطرت میں نہ نوری ہے نہ ناری ہے

٭

یقیں محکم، عمل پیہم، محبت فاتحِ عالم
جہادِ زندگانی میں ہیں یہ مردوں کی شمشیریں

بھرتری ہری

اقبالؔ مشہور سنسکرت شاعر 'بھرتری ہری' کے بڑے مدّاح ہیں۔ ایک روایت کے مطابق بھرتری ہری اُجین کا راجہ تھا جو اپنی زندگی کے ابتدائی ایام میں عیش و عشرت میں پڑ گیا تھا مگر آخر کار اس نے دنیا کو تیاگ کر خود کو تپسیا، دھیان اور فلسفہ و شاعری کے لئے وقف کر دیا۔ مکس مُولر (Max Mueller) اس کا زمانہ ساتویں صدی عیسوی بتاتا ہے مگر اس بارے میں اختلاف پایا جاتا ہے...... مکس مُولر کا خیال ہے کہ بھرتری ہری کی شاعری کا ایک اہم پہلو یہ ہے کہ وہ بھی عمل (کرم) کو نتائج سے بے تعلق کر کے دیکھتا ہے جو بھگوت گیتا کی بنیادی تعلیم ہے۔ "جاوید نامہ" میں اقبالؔ جنت میں بھرتری ہری کا تعارف رومی سے یہ کہہ کر کراتے ہیں ؎

آں نوا پردازِ ہندی را نگر
شبنم از فیضِ نگاہِ او گہر

(ذرا اس ہندوستانی شاعر کو دیکھو جس کے فیضِ نگاہ سے قطرۂ شبنم گوہر بن جاتا ہے۔)

کارگاہِ زندگی را محرم است
او جم است و شعر او جامِ جم است

(وہ زندگی کے کارخانے کا واقفِ اسرار ہے۔ گویا وہ جمشید ہے اور اس کے اشعار جامِ جمشید کی طرح جہاں نما ہیں۔)

اقبالؔ بھرتری ہری سے اتنا متاثر تھے کہ انہوں نے اپنے دوسرے مجموعۂ اردو "بالِ جبریل" میں اس کا ایک شعر دستور العمل کے طور پر درج کیا ہے ؎

پھول کی پتّی سے کٹ سکتا ہے ہیرے کا جگر
مردِ ناداں پر کلامِ نرم و نازک بے اثر

یہ شعر بھرتری ہری کی "نیتی شتک" سے ماخوذ ہے۔

رامائن کو نظم کرنے کا ارادہ

ان سب باتوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ اقبالؔ ہندوستانی فلسفے، دیو مالا اور مذہبی عقائد سے گہری واقفیت رکھتے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ وہ ہندوستان کی رزمیہ شاعری کے بھی بڑے مداح تھے اور ایک زمانے میں انہوں نے رامائن کو اُردو نظم کا جامہ پہنانے کا ارادہ کیا تھا۔ مہاراجہ سرکشن پرشاد کے نام اپنے ایک خط میں انہوں نے لکھا کہ عہدِ جہانگیری کے شاعر مسیحؔی پانی پتی نے اس رزمیہ کا فارسی میں ترجمہ کیا تھا۔ اقبالؔ نے مہاراجہ سے درخواست کی کہ وہ اپنے کتب خانہ میں مسیحی کا نسخہ تلاش کرائیں۔ بدقسمتی سے یہ کتاب نہیں مل سکی اس لئے یہ منصوبہ بھی آگے نہ چل سکا۔

ہندوستانی اوتاروں، سنتوں کا احترام

رام چندر جی پر اپنی نظم میں وہ ان کی بہادری، پاکیزگی اور انسانیت سے گہری محبت کی تعریف کرتے ہیں ؎

تلوار کا دھنی تھا، شجاعت میں فرد تھا
پاکیزگی میں، جوشِ محبت میں فرد تھا

یہ بات قابلِ توجہ ہے کہ یہ نظم ان کی شاعری کے اس تیسرے دور کی ہے جسے عام طور پر "اسلامی دور" کہا جاتا ہے۔

اسی طرح انہوں نے گورونانک جی پر ایک دل کو چھونے والی نظم لکھی اور اُن کے نظریۂ توحید کو سراہا ؎

پھر اُٹھی آخر صدا توحید کی پنجاب سے
ہند کو اِک مردِ کامل نے جگایا خواب سے

ایک اور ممتاز ہندو رہنما، جن سے اقبال متاثر ہوئے، وہ سوامی رام تیرتھ تھے۔ سوامی جی کے واصلِ حق ہونے پر کہی گئی اقبال کی نظم کا یہ شعر خوبصورت خراجِ عقیدت ہے ؎

نفیِ ہستی اِک کرشمہ ہے دلِ آگاہ کا
'لا' کے دریا میں نہاں موتی ہے الا اللہ کا

ہندوستان کی تعریف

دوسری نظموں میں بھی جہاں کہیں موقع ملا ہے، انہوں نے ہندوستان کی تعریف کی ہے۔ مثلاً جب وہ مسلمانوں کے لیے ایک شاندار مستقبل کا خواب دیکھتے ہیں تو

کہتے ہیں ؎

عطا مومن کو پھر درگاہِ حق سے ہونے والا ہے
شکوہِ ترکمانی، ذہنِ ہندی، نطق اعرابی

اسی طرح انہوں نے ہندوستان کی ماہ سیماؤں کو یورپ میں بھی فراموش نہیں کیا ؎

میں نے اے اقبالؔ یورپ میں اسے ڈھونڈا عبث
بات جو ہندوستاں کے ماہ سیماؤں میں تھی

جاوید کو نصیحت کرتے ہیں، تو کہتے ہیں ؎

اُٹھا نہ شیشہ گرانِ فرنگ کے احساں
سفالِ ہند سے مینا و جام پیدا کر

تحریکِ آزادی

اپنی شاعری میں اور دوسری تحریروں میں اقبالؔ نے ہندوستان کے برطانوی سامراج کے غلام ہونے پر مسلسل اپنے رنج و کرب کا اظہار کیا ہے۔ ان کی ابتدائی دور کی نظم 'پرندے کی فریاد' بھی ہندوستان کی غلامی پر ایک علامتی نظم ہے۔ اقبالؔ کی روح اس سے بھی بغاوت کرتی تھی کہ سیاسی محکومی کے اثر سے ہندوستانی اپنے سوچنے کے انداز میں بھی مغرب کے غلام ہوتے جا رہے ہیں۔ ان کے بیشتر اشعار میں اس کرب کا اظہار ہوا ہے ؎

بندگی میں گھُٹ کے رہ جاتی ہے اک جوئے کم آب
اور آزادی میں بحرِ بے کراں ہے زندگی

٭

تھا جو ناخوب، بتدریج وہی خوب ہوا
کہ غلامی میں بدل جاتا ہے قوموں کا ضمیر

٭

بھروسہ کر نہیں سکتے غلاموں کی بصیرت پر
کہ دنیا میں فقط مردانِ حُر کی آنکھ بینا ہے

سودیشی تحریک کی حمایت

علامہ اقبال نے سودیشی تحریک کی بھی حمایت کی تھی۔ رسالہ "زمانہ" کانپور کے مئی ۱۹۰۶ء کے شمارے میں شائع ہوئے علامہ کے ایک مضمون نما مراسلے سے جو کیمبرج یونیورسٹی سے لکھا گیا تھا، یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ ان کے دل میں اپنے وطن سے بے پناہ اُلفت، اپنے ہم وطنوں میں اتفاق و اتحاد پیدا کرنے کا جذبۂ صادق اور ملک کو خوشحال دیکھنے کی تڑپ بدرجہ اتم موجود تھی۔ وہ سودیشی تحریک کو ہندوستان کے لئے بے حد ضروری سمجھتے تھے۔

گاندھی جی کے اوصاف پر نظم

۲۱ر نومبر ۱۹۲۱ء کے روز نامہ "زمیندار" میں اقبال کی یہ نظم شائع ہوئی جس میں مہاتما گاندھی کو "مردِ پختہ کار و حق اندیش و باصفا" کہا گیا ہے[1]

بولا یہ بات سن کے کمالِ وقار سے
وہ مردِ پختہ کار و حق اندیش و باصفا

---

[1] سرگذشتِ اقبال: عبدالسلام خورشید ص ۱۵۱ - ۱۵۰

جلیانوالہ باغ کے سانحۂ عظیم کا اثر

جلیانوالہ باغ کے قتلِ عام سے اقبالؔ بہت متاثر ہوئے تھے۔[1] روایت ہے کہ مندرجہ ذیل اشعار میں غالبًا اسی واقعہ کا اظہار ہے ؎

ہر زائرِ چمن سے یہ کہتی ہے خاکِ پاک — غافل نہ رہ جہان میں گردوں کی چال سے
سینچا گیا ہے خونِ شہیداں سے اس کا تخم — تو آنسوؤں کا بُخل نہ کر اس نہال سے

البتہ یہ اشعار ان کے کسی مجموعہ میں شامل نہیں ہوئے۔

چورا چوری کا واقعہ

'چورا چوری' کے تشدد آمیز واقعہ کا بھی اقبالؔ کے دل و دماغ پر گہرا اثر پڑا۔ اپنے ایک خط میں اس واقعہ کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"[2] ہندوستان میں بظاہر مہاتما گاندھی کی گرفتاری کے بعد امن و سکون ہے مگر قلوب کا ہیجان حیرت انگیز ہے۔ اتنے عرصے میں اتنا انقلاب تاریخِ اُمم میں بے نظیر ہے۔"

مغرب کی غلامی پر لعنت

اقبالؔ دانشوری کی سطح پر ان حالات سے نپٹنے کے لئے دو تجویزیں پیش کرتے ہیں۔ ان میں سے ایک یہ تھی کہ شدید ترین الفاظ میں مغربی تعلیم، مغربی فکر،

---

[1] باقیاتِ اقبال: مرتبہ عبدالواحد معینی و عبداللہ قریشی ص ۲۳۸

[2] سرگذشتِ اقبال: عبدالسلام خورشید ص ۱۵۱

مغربی تہذیب اور مغربی روایات کی مذمت کی جائے اور دوسری جذبۂ خودی کی نشو و نما۔
اوّل الذکر کے بارے میں ان کے مندرجہ ذیل اشعار ملاحظہ ہوں ؎

ابھی تک آدمی صیدِ زبون شہر یاری ہے
قیامت ہے کہ انساں نوعِ انساں کا شکاری ہے

.....

وہ حکومت، ناز تھا جس پر خردمندانِ مغرب کو
ہوس کے پنجۂ خونیں میں تیغِ کار زاری ہے

✽

میخانۂ یورپ کے دستور نرالے ہیں
لاتے ہیں سُرور اوّل، دیتے ہیں شراب آخر

اقوامِ مشرق اور خاص طور پر ہندوستان کی غلامی پر علامہ اقبالؔ کے کرب و اندوہ، انگریزی سامراجیت کے خلاف بغاوت اور سودیشی تحریک کی حمایت کا مؤثر بیان ان کی فارسی مثنوی "پس چہ باید کرد اے اقوامِ شرق" (۱۹۳۶ء) میں بھی ہے۔ اس نظم میں انہوں نے یہ سمجھایا ہے کہ کس طرح انگریزوں نے انسانیت کو برباد کیا ہے۔ کیسے کمزور قوموں کو ہڑپ کر گئے ہیں۔ کیسے اپنے علم و فن سے بنی نوعِ آدم کا شکار کرتے ہیں اور کس طرح تجارت کو اپنی شاطرانہ سیاست کا دامِ فریب بنا کر عوام کا خون چوستے ہیں ؎

آدمیت زار نالید از فرنگ
زندگی ہنگامہ برچید از فرنگ

(آدمیت فرنگیوں سے زار زار رو رہی ہے۔ زندگی نے فرنگیوں سے ہنگامہ سیکھا ہے۔)

آں جہاں بانے کہ ہم سوداگر است
بر زبانش خیر و اندر دل شر است

(وہ انگریز حاکم جو تاجر بھی ہے۔ اس کی زبان پر نیکی کی بات ہے مگر دل میں بدی ہے۔)

گر تو میدانی حسابش را درست
از حریرش نرم تر کرپاسِ تست

(اگر تم حساب اچھی طرح سمجھتے ہو تو جانو گے کہ اُن کے ریشمی کپڑوں سے تمہارا کھدر زیادہ نرم ہے۔)

آنچہ از خاکِ تو رُست اے مردِ حُر
آں فروش و آں بپوش و آں بخور

(وہ دور اندیش لوگ جو اپنے نفس کا عرفان رکھتے ہیں، وہ اپنی کملی خود ہی بُنتے ہیں۔)

آخر میں علامہ اقبال اقوام مشرق کی بیداری اور آزادی کی بشارت دیتے ہیں ؎

پس چہ باید کرد اے اقوامِ شرق
باز روشن می شود ایّامِ شرق

(پس اے اقوامِ ایشیا! بتاؤ اب کیا کرنا چاہیئے؟ تاکہ مشرق کے دن پھر روشن ہو جائیں۔)

در ضمیرش انقلاب آمد پدید
شب گذشت و آفتاب آمد پدید

(مشرق کے ضمیر میں ایک انقلاب پیدا ہو چلا ہے۔ گویا رات گذر گئی ہے اور سورج نکل آیا ہے۔)

فلسفۂ خودی

دوسری حکمتِ عملی جسے انہوں نے شعوری یا غیر شعوری طور پر ہندوستان میں برطانوی اقتدار کے خلاف استعمال کیا، وہ ان کا نظریۂ خودی ہے۔ انہوں نے اپنے ہم وطنوں کو ترغیب دی کہ وہ انفرادی اور اجتماعی سطح پر اپنے وجود کا اثبات کریں تاکہ اپنی قوتوں کو زیادہ سے زیادہ بروئے کار لاسکیں ..... میری ناقص رائے میں اس زمانے میں یہ نظریہ اس عہد پر چھائے ہوئے حالات کا نتیجہ تھا جس کے اخلاقی اور معاشرتی ماحول اور سیاسی نظام میں اقبال نے آنکھیں کھولی تھیں اور پروان چڑھے تھے ...... میں اقبال کے فلسفۂ خودی کو ایک نہایت حساس شاعر کی طرف سے اپنے ملک کی سیاسی غلامی کا ردّعمل سمجھتا ہوں۔ اپنے کلام میں انہوں نے اس موضوع پر بہت کچھ کہا ہے ؎

خودی کی موت سے ہندی شکستہ بالوں پر
قفس ہوا ہے حلال اور آشیانہ حرام

٭

سنا ہے میں نے غلامی سے امتوں کی نجات
خودی کی پرورش و لذتِ نمود میں ہے

سیاسی میدان میں گاندھی جی کی ستیہ گرہ بھی ایک طرح سے قومی خودی کا اظہار ہی تھا، جیساکہ اقبال نے کہا ہے، اور فکری سطح پر اقبال کا خودی پر زور دینا بھی سامراجی قوتوں کے خلاف ایک طرح کا ستیہ گرہ ہی تھا۔

قومی یک جہتی نجی زندگی کے آئینے میں

ان کی شخصی زندگی بھی قومی یک جہتی کی ایک درخشاں مثال ہے۔ ان کے احباب اور مداحوں کا ایک وسیع حلقہ تھا جس میں ملک کے مختلف حصوں کے اور ہر فرقہ و مذہب کے لوگ شامل تھے۔ اس حقیقت کے باوجود کہ اس وقت کے لاہور ہائی کورٹ کے چیف جسٹس سر شادی لال نے بینچ میں ان کی شمولیت کی مخالفت کی اور اس تکلیف دہ تجربہ کے باوجود جس میں فرقہ پرست عناصر کی سازش سے ان کے بڑے بھائی کو ایک جھوٹے مقدمے میں پھانسا گیا تھا، ہندوؤں اور سکھوں میں مقتدر حضرات سے اقبال کے بہترین دوستانہ تعلقات تھے۔ مثلاً مہاراجہ سر کشن پرشاد، سر جوگندر سنگھ، سردار امراؤ سنگھ، شہزادی بمبا دلیپ سنگھ، سروجنی نائیڈو اور ڈاکٹر ملک راج آنند۔

سروجنی نائیڈو کو اقبال سے بڑی گہری عقیدت تھی۔ ایک زمانہ میں تو وہ اس حد تک متاثر تھیں کہ اپنے ایک نجی انگریزی خط میں، جو انہوں نے ۱۵ اکتوبر سنہ ۱۹۲۶ء کو بمبئی سے پنڈت جواہر لال نہرو کے نام لکھا تھا، بے ساختہ اقبال کے ایک مصرع کا ایک حسین ٹکڑا لکھتی چلی جاتی ہیں:

"مجھے ڈر ہے کہ آپ میری عجلت میں لکھی ہوئی تحریر پڑھ بھی سکیں گے یا نہیں۔ میری کلائی میں سخت درد ہے، جسے اقبال کے لفظوں میں یوں کہا جا سکتا ہے کہ "میں سراپا درد ہوں"[1]"

1-I wonder if you can read my scrawl. My wrist is stiff with pain. "Main sara-pa-dard hun" to quote Iqbal literally.

A Bunch of old letters : Jawahar Lal Nehru p-49

۱۹۲۲ء میں ملک راج آنند نے جو اس وقت ایک نوجوان طالب علم تھے اور شاعر بننے کی تمنا رکھتے تھے، اقبال سے ملاقات کی۔ انہوں نے اقبال سے کہا کہ میری ایک دوست اور میری بھابھی باہر انتظار کر رہی ہیں۔ یہ سن کر اقبال خود اُٹھے اور انہیں اندر لے آئے۔ اس اخلاص سے حوصلہ پاکر ملک راج آنند نے عرض کیا "میں کچھ نظمیں اور طفلانہ محبت کے اشعار (Calf-Love Poems) لایا ہوں"۔ یہ کہہ کر انہوں نے اپنی دوست یاسمین کی طرف دیکھا۔ اقبال نے کہا "اگر وہ طفل (Calf) یہ حسین لڑکی ہے تو تم دونوں کو مبارک ہو"! ملک راج آنند نے کہا "میں ایک ہندو گھرانے میں پیدا ہوا ہوں اور یہ لڑکی مسلمان ہے"! اس پر اقبال نے کہا "اس طرح کا ملاپ تو میں چاہتا ہوں"! اس واقعہ سے ظاہر ہوا کہ وہ کیسا محبت بھرا دل رکھتے تھے۔ ہر ایک سے ان کے تعلقات کیسے مخلصانہ تھے، خواہ وہ کسی بھی ذات، عقیدے یا مذہب سے تعلق رکھتا ہو۔

دو یتیم ہندو بچوں کی دستگیری

علامہ کی قیام گاہ کے نزدیک سینما تھا۔ ایک بار جب کسی نے ان سے یہ کوٹھی بدل لینے کو کہا تو آپ نے یہ کہہ کر ٹال دیا کہ اصل بات یہ ہے۔ اس کوٹھی کے وارث دو یتیم ہندو بچے ہیں، جنہیں میں ۱۳۰ روپے کرایہ دیتا ہوں میں

(حاشیہ متعلق ص ۳۴)

یہ "بانگِ درا" کی نظم صقلیہ (جزیرہ سسلی) کے اس شعر سے ماخوذ ہے ۔

درد اپنا مجھ سے کہہ میں بھی سراپا درد ہوں۔

جس کی تو منزل تھا میں اس کارواں کی گرد ہوں۔

نے اگر یہ کوٹھی چھوڑ دی تو اس کا اتنا کرایہ ان یتیموں کو شاید نہ مل سکے۔

فتویٰ کفر

مختلف فرقوں کے افراد سے قریبی تعلق رکھنے کی بنیاد پر کبھی کبھی اقبال کو سمجھنے میں بھی لوگوں سے غلطی ہوئی۔ 'آفتاب' جیسی نظم لکھنے اور خصوصاً اپنی نظم 'رام' میں ان کو 'امام' اور 'چراغِ ہدایت' کہنے پر اقبال کو اپنے بعض کٹر ہم مذہبوں کی نظر میں معتوب ہونا پڑا شاید ان ہی واقعات کی بنا پر ان کو کہنا پڑا ؎

زاہدِ تنگ نظر نے مجھے کافر جانا
اور کافر یہ سمجھتا ہے مسلمان ہوں میں

برہمن نژاد ہونے پر ناز

اس موقع پر میں یہ بھی کہنا چاہوں گا کہ اقبال اپنے برہمن نژاد ہونے پر نازاں تھے اس سلسلہ میں ان کا یہ شعر بہت مشہور ہے ؎

مرا بنگر کہ در ہندوستاں دیگر نمی بینی
برہمن زادۂ رمز آشنائے روم و تبریز است

(مجھے دیکھو، کیونکہ ہندوستان میں دوسرا کوئی ایسا نہیں ملے گا جو برہمن زادہ ہوتے ہوئے بھی روم و تبریز کا محرم اسرار ہو۔)

اقبال اور پاکستان

اقبال کے ساتھ ناانصافی ہوگی اگر یہاں اس بحث کا حوالہ نہ دوں کہ اقبال پاکستان کے بانیوں میں سے ایک تھے۔ حال ہی میں اقبال کے کچھ خطوط دریافت

ہوئے ہیں جو یہ ظاہر کرتے ہیں کہ وہ انڈین یونین (Indian Union) کے اندر ایک ایسی خود مختار ریاست کے حق میں تھے، جو پنجاب، شمال مغربی سرحدی صوبہ، سندھ اور بلوچستان پر مشتمل ہو۔ جیسا کہ انہوں نے اپنے اس خطبۂ صدارت میں واضح کیا ہے جو ۲۹ر دسمبر ۱۹۳۰ء کو الہ آباد میں مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس میں پڑھا گیا تھا۔ اس زمانے میں ایڈورڈ تھامسن (Edward Thompson) نے اقبال کے خطبات "تشکیلِ جدید الہیاتِ اسلامیہ" پر تبصرہ کرتے ہوئے جو آبزرور (Observer) لندن میں شائع ہوا تھا، ان کے اس منصوبے کو نظریۂ پاکستان سے خلط ملط کر دیا۔ اس پر اقبال نے تھامسن کو لکھا:

"آپ مجھے نظریۂ پاکستان کا حامی قرار دیتے ہیں مگر پاکستان میرا منصوبہ نہیں ہے۔ میں نے اپنے خطبۂ صدارت میں جو تجویز پیش کی تھی، وہ صرف ایک مسلم صوبہ کی تشکیل ہے۔ یعنی ہندوستان کے شمال مغرب میں ایک ایسا صوبہ جس میں مسلمانوں کی اکثریت ہو۔ یہ (نیا) صوبہ میرے منصوبے کے مطابق ہندوستانی وفاق (Federation) کا ایک حصہ ہوگا جب کہ نظریۂ پاکستان میں مسلمانوں کے ایک جداگانہ وفاق کی تجویز رکھی گئی ہے جو براہ راست انگلستان سے مربوط ایک علیحدہ ریاست ہو۔"

یہاں یہ جاننا بھی دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ پنڈت جواہر لال نہرو نے بھی اس عام طور پر شائع غلط فہمی کی تردید کی تھی کہ اقبال نظریۂ پاکستان کے بانی تھے۔ یہ انہوں نے اپنی کتاب "Discovery of India" میں لکھا ہے[1]:

" اقبال پاکستان کے ابتدائی حامیوں میں سے ایک تھے مگر ایسا معلوم ہوتا

---

[1] چوتھا ایڈیشن، لندن ۱۹۵۶ء ص ۳۵۴ - ۳۵۵

ہے کہ انہوں نے بھی اس نظریہ میں پوشیدہ خطرے کو اور اس کی نامعقولیت کو محسوس کر لیا تھا .... ان کا مکمل نظریہ زندگی، نظریۂ پاکستان یا تقسیم ہند کے بعد رونما ہونے والی تبدیلیوں سے میل نہیں کھاتا .... اپنی موت سے چند ماہ پہلے جب وہ بسترِ مرگ پر پڑے ہوئے تھے، انہوں نے مجھے بلوایا اور میں نے بہ خوشی ان کی دعوت پر لبیک کہا .... میرے رخصت ہونے سے ذرا پہلے انہوں نے مجھ سے کہا " تم میں اور جناح میں کیا بات مشترک ہوسکتی ہے ؟ وہ ایک سیاست دان ہیں اور تم ایک محبّ وطن ہو "

آل احمد سرور صاحب کا خیال ہے کہ اقبالؔ نے ۱۹۳۷ء میں نظریۂ پاکستان کے بارے میں اپنا خیال تبدیل کر دیا تھا۔ انہوں نے ۲۸ مئی ۱۹۳۷ء کو محمد علی جناح کے نام اپنے خط میں لکھا تھا :

" مسلم ہندوستان کے لیے ان مسائل کا حل ممکن بنانے کے لئے یہ ضروری ہے کہ ملک کو دوبارہ تقسیم کیا جائے اور مسلمانوں کے لئے ایک یا ایک سے زیادہ صوبے بنائے جائیں، جن میں اُن کی قطعی اکثریت ہو "

اس کے بعد محمد علی جناح کے نام ۲۱ جون ۱۹۳۷ء کے ایک خط میں انہوں نے ایک قدم اور آگے بڑھاتے ہوئے لکھا :

" مسلم صوبوں کا میری مذکورہ بالا تجاویز کی روشنی میں بنایا ہوا ایک علیحدہ وفاق وہ واحد حل ہے جس کے ذریعے ہم ہندوستان کو پرامن رکھ سکتے ہیں اور مسلمانوں کو غیر مسلموں کے غلبہ سے بچا سکتے ہیں۔ آخر شمال مغربی ہندوستان اور بنگال کے مسلمان " قوم " کیوں نہیں سمجھے

جا سکتے۔ جنہیں حقِ خود اختیاری حاصل ہو جیسے ہندوستان میں اور ہندوستان سے باہر دوسری قوموں کو حاصل ہے"!

آل احمد سرور صاحب نے اس طرف اشارہ کیا ہے کہ اقبال پہلی بار جداگانہ وفاق کا اس خط میں تذکرہ کرتے ہیں اور یہ نتیجہ نکالا ہے کہ اگرچہ اقبال نے لفظ پاکستان استعمال نہیں کیا مگر ۱۹۳۷ء میں اپنی وفات سے ایک سال سے ذرا پہلے وہ دو جداگانہ مسلم ریاستوں کی تشکیل کی تجویز ردّ کر رہے ہیں جن میں سے ایک شمال مغربی ہندوستان میں اور دوسری شمال مشرق میں ہو۔ آخر میں سرور صاحب کہتے ہیں کہ شاید تھامسن کے حافظے نے اسے کچھ دھوکہ دیا ہو۔

میرا خیال ہے کہ اقبال کے خطوں سے جو مطلب سرور صاحب نے نکالا ہے وہ اس موضوع پر اقبال کے اندازِ فکر سے مطابقت نہیں رکھتا .... مسئلہ کا نچوڑ اس خط میں آگیا ہے جو اقبال نے ۲۱ جون ۱۹۳۷ء کو جناح کے نام لکھا تھا۔ غور کرنے کی بات یہ ہے کہ اس خط میں بھی شمال مشرقی ہندوستان اور بنگال کے صوبوں کے بارے میں سوچ رہے ہیں کہ وہ خود مختار ہوں اور ہندوستان کے غیر پیوستہ وفاق میں شامل ہوں ورنہ وہ 'ہندوستان کی دوسری قوموں کی طرح' کے الفاظ استعمال نہ کرتے۔ دیکھنا یہ ہے کہ ہندوستان میں دوسری قومیں کونسی ہیں ؛ سوائے اس کے کہ ہم یہ مان لیں کہ قوموں سے وہ ہندوستان کی دوسری ریاستیں اور صوبے مراد لے رہے ہیں اور یقیناً یہی وہ بات ہے جو اقبال کے ذہن میں تھی۔

سرسید احمد خاں بھی اقبال کی طرح فرقہ وارانہ اتحاد و اتفاق، مذہبی رواداری اور باہمی یگانگت کے علمبردار تھے اور انہوں نے اپنی تحریر و تقریر کے ذریعے ہندو مسلم اتفاق کو مضبوط کرنے کی انتہائی کوشش کی۔ انہوں نے اپنی زندگی، اپنے عمل اور

برتاؤ سے بھی یگانگت اور فراخ دلی کا ثبوت دیا۔ انہوں نے عمر بھر اپنے ہندو ہم وطنوں سے مل جل کر تعمیری کاموں میں حصہ لیا۔ انہوں نے مسلمان بچوں کے ساتھ ساتھ ہندو بچوں کے لیے بھی یتیم خانے کھولنے کی تجویز رکھی۔ ۱۸۶۳ء میں سائنٹفک سوسائٹی کے قیام کے وقت بھی انہوں نے ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں سے اس کارِ خیر میں حصہ لینے کی اپیل کی۔ بعد میں انہوں نے اس سوسائٹی کی ذمہ داریاں راجہ جے کشن داس کو سونپ دیں جو اس وقت علی گڑھ میں ڈپٹی کلکٹر تھے۔ ۱۸۶۴ء میں غازی پور کے ایک مدرسے کا سنگِ بنیاد انہوں نے راجہ دیو نرائن سنگھ سے رکھوایا اور راجہ صاحب ہی اس مدرسے سرپرست مقرر کئے گئے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ سرسید احمد خاں اپنی تعلیمی تحریک میں ہندوؤں اور مسلمانوں کی شرکت چاہتے تھے۔ اس کالج کے قیام کے لئے ہندوؤں نے بھی فراخ دلی سے چندہ دیا۔ مدرسۃ العلوم کے پچاس کمروں میں سے نو کمرے چودھری شیر سنگھ، راجہ دیو نرائن سنگھ اور لالہ پھول چند وغیرہ کے عطیے سے بنے۔ اس کے اسٹریچی ہال میں آویزاں تختیوں پر دس ہندوؤں کے نام بھی کندہ ہیں جنہوں نے عمارت کی تعمیر کے لئے گرانقدر عطیے دئے۔ اس کے علاوہ غریبوں نے بھی اپنی بساط کے موافق اس کی مالی امداد کی۔ چنانچہ بیان کیا جاتا ہے کہ پنجاب میں کرتار پور کے ایک شخص رام چندر نے گاؤں کے اسکول سے جمع کیے گئے آٹھ روپے نو آنے ان کو چندہ میں پیش کئے۔

سرسید احمد خاں کے انتقال کے وقت ۱۸۹۸ء ۲۸۵ مسلمان اور ۶۴ ہندو طلبا اس کالج میں زیر تعلیم تھے۔ اسی طرح سات اساتذہ میں سے دو ہندو پروفیسرز جے۔ سی۔ چکرورتی (ریاضی) اور پنڈت شیو شنکر شرما (سنسکرت) کو اہم مقام حاصل تھا۔ ان کی بے تعصبی کی اس سے بڑی دلیل اور کیا ہو سکتی ہے کہ اس مدرسہ کا پہلا گریجویٹ ایک ہندو تھا۔ ایجوکیشن کمیشن کے اُس وقت کے صدر سر ولیم ہنٹر نے بھی اس ادارے

کی ایک رپورٹ میں لکھا تھا کہ اس درسگاہ کے کل ۲۵۹ طلباء میں سے ۷۵ یعنی ایک چہارم (۲۵ فیصد) ہندو ہیں۔

انہوں نے قومی اتحاد اتفاق کی خاطر مسلمانوں کو یہاں تک مشورہ دیا کہ "اگر گائے کی قربانی ترک کرنے سے ہندو مسلم اتحاد پیدا ہوسکتا ہے تو مسلمانوں کے لئے یہ بات ہزار گنا بہتر ہے کہ وہ گائے کی قربانی سے باز آئیں"

۲۷ جنوری ۱۸۸۳ء کو پٹنہ میں اپنی ایک مشہور تقریر میں انہوں نے کہا تھا:

"اے عزیزو! جس طرح ہندوؤں کی شریف قومیں اس ملک میں آئیں، اسی طرح ہم بھی اس ملک میں آئے۔ ہندو اپنا ملک بھول گئے۔ اپنے دیس سے پردیس ہونے کا زمانہ ان کو یاد نہیں رہا اور ہندوستان ہی کو انہوں نے اپنا وطن سمجھا۔ ہم نے بھی ہندوستان کو اپنا وطن سمجھا۔ پس اب ہندوستان ہی ہم دونوں کا وطن ہے۔ ہندوستان کی ہی ہوا سے ہم دونوں جیتے ہیں۔ مقدس گنگا۔ جمنا کا پانی ہم دونوں پیتے ہیں۔ ہندوستان کی زمین کی پیداوار ہم دونوں کھاتے ہیں۔ مرنے میں، جینے میں دونوں کا ساتھ ہے۔ مسلمانوں نے ہندوؤں کی سینکڑوں رسمیں اختیار کرلیں۔ ہندوؤں نے مسلمانوں کی سینکڑوں عادتیں لے لیں۔ پس اگر ہم اس حصہ سے جو ہم دونوں میں خدا کا حصہ ہے، قطع نظر کریں تو درحقیقت ہندوستان میں ہم دونوں باعتبار اہلِ وطن ہونے کے ایک قوم ہیں اور ہم دونوں کے اتفاق اور باہمی ہمدردی اور آپس کی محبت سے ملک کی اور ہم دونوں کی ترقی و بہبود ممکن ہے۔ اے میرے دوستو! میں نے بارہا کہا ہے اور پھر کہتا ہوں کہ ہندوستان ایک دلہن کی مانند ہے۔ جس کی خوبصورت اور رسیلی

دو آنکھیں ہندو اور مسلمان ہیں۔ اگر وہ دونوں آپس میں نفاق رکھیں گے
تو وہ پیاری دلہن بھینگی ہو جاوے گی۔"

چنانچہ اقبالؔ کی نظم "سید کی لوحِ تربت" ان کے اس پیغام کو دہراتی ہے ؎

چھپ کے ہے بیٹھا ہوا ہنگامۂ محشر یہاں
وا نہ کرنا فرقہ بندی کے لئے اپنی زباں

دیکھ کوئی دل نہ دکھ جائے تری تقریر سے
وصل کے اسباب پیدا ہوں تری تحریر سے

محفلِ نو میں پرانی داستانوں کو نہ چھیڑ
رنگ پر جو اَب نہ آئیں ان فسانوں کو نہ چھیڑ

مختصر یہ ہے کہ قومی یک جہتی کا سبق ہم اقبالؔ کی شاعری سے سیکھتے ہیں۔ آخری دم تک وہ اپنے وطن سے سچی اور گہری محبت کرتے رہے اور ان کا پیغام یہی ہے کہ ہمیں اپنے ملک پر، اس کے بیش قیمت ورثے پر، اس کی موجودہ ترقی اور شاندار مستقبل پر ناز ہو مگر بدقسمتی سے ہمارا یہ قومی مشغلہ سا بن گیا ہے کہ اپنے ملک اور اپنے ہم وطنوں پر ملامت کرتے رہیں۔ ہر سمجھدار آدمی کو یقیناً تنقیدی رویہ اختیار کرنا چاہیئے لیکن اسے اچھی باتوں کو سراہنے کے لئے انصاف کا دامن بھی ہاتھ سے نہیں چھوڑنا چاہیئے۔ وطن دوستی کا صحت مند جذبہ ہی قومی اتحاد کی بنیاد ہوتا ہے۔

ہندوستانی فکر کو اقبالؔ کی سب سے بڑی دین ان کا نظریۂ خودی (خود اعتمادی و خود انحصاری) ہے۔ یہ پیغام آج بھی اتنا ہی مطابقِ حالات ہے جتنا اُن کے زمانے میں تھا۔

ایک اور سبق جو ہمیں اقبالؔ کے کلام سے ملتا ہے۔ وہ یہ ہے کہ ہمیں اپنے ملک، ملک کے ہر مذہب اور ہر عقیدے کی بنیادی تعلیمات اور اساسی عقاید کو سمجھنے اور ان کی قدر کو پہچاننے کی کوشش کرنی چاہیئے کیونکہ ہمارے ملک میں

مختلف فرقے، مختلف مذاہب کے ماننے والے اور مختلف زبانیں بولنے والے لوگ بستے ہیں۔ ہمیں دوسرے فرقوں کے مذہبی رہنماؤں کا اور Heroes کا بھی احترام کرنا چاہیئے اور ان کے بارے میں کچھ واقفیت بھی پیدا کرنی چاہیئے۔ اقبال نے اسلام سے اپنی گہری وابستگی کے باوجود ہندوستانی فکر وفلسفہ کا مطالعہ کیا اور اس کی خوبیوں کو اپنے فکر میں جذب کیا۔ یہ بہت ہی افسوس کی بات ہے کہ آج بھی ایک مذہب کے ماننے والے دوسرے مذہب کے بنیادی عقیدوں سے بے خبر ہیں۔ سیکولرازم کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ ہم مذہب کو بالکل ہی خیرباد کہہ دیں۔ سیکولرازم کا اساسی نظریہ یہ ہے کہ مذہب کو حکومت کے معاملات سے کوئی سروکار نہ ہو۔ اس لئے ایک سیکولر ملک میں بھی بچوں کو مختلف مذاہب کے بنیادی اصول وعقاید سے واقف کرانا غیر مناسب نہیں ہوگا۔

اس یونیورسٹی کو آج بھی یہ فخر حاصل ہے کہ یہاں ہندو مسلم طلبا وطالبات شیر وشکر کی طرح رہتے ہیں، جس کی مثال اور کہیں نہیں ملتی۔ اس لحاظ سے یہ ایک مثالی یونیورسٹی ہے جہاں مذہبی بنیادوں پر کوئی تفریق، کوئی امتیاز نہیں کیا جاتا۔ مجھے امید ہے کہ یہاں کے طلبا وطالبات ان گرانمایہ روایات واقدار کو ہمیشہ قائم رکھیں گے۔ مجھے یقین کامل ہے کہ اس درسگاہ کا مستقبل نہایت تابناک اور روشن ہے اور میری دعا ہے کہ یہ مینارۂ نور نہ صرف ملک میں بلکہ بیرونِ ملک کے طلبا کے لئے بھی قدیم اور جدید علوم کی روشنی ہمیشہ پھیلاتا رہے۔

❖ ❖ ❖